ڈاکٹر وزیر آغا.....کچھ خطوط، کچھ سوالات

ڈاکٹر زاہد منیر عامر، پروفیسر شعبۂ اُردو، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

Abstract

Dr Wazir Agha (1922-2009) is a well-known critic, poet and light essayist. There are over fifty books on these genres, to his credit. He edited a legendary literary magazine, Awraq, for many decades. In this article, the author has remembered him, through his personal reflections. Unpublished letters of Dr Wazir Agha, addressed to the author, have been produced in this article. They not only express his sentiments towards his addressee but also, reflect his literary ideas regarding modern peotry. Some questions raised by the author are also answered by the literary genius. Issues requiring explanations have been expounded on, in the footnotes.

ڈاکٹر وزیر آغا (۱۸ مئی ۱۹۲۲ء.....۷ ستمبر ۲۰۱۰ء) سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج جھنگ سے بی اے کیا۔ ایم اے کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور آ گئے جہاں سے انھوں نے ۱۹۴۳ء میں معاشیات میں ایم اے کیا، اردو ادب میں طنز و مزاح کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ۱۹۵۶ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۳ء تک اپنے وقت کے معروف جریدے ادبی دنیا کی ادارت میں مولانا صلاح الدین احمد کی معاونت کی۔ جنوری ۱۹۶۶ء میں رسالہ اوراق جاری کیا جو ان کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے تک شائع ہوتا رہا۔ وہ ایک رجحان ساز انشائیہ نگار، اپنے عہد کے اہم نظم گو شاعر اور اردو ادب کے نظریہ ساز نقاد تھے۔ ان کی نصف صد سے زائد کتب تنقید، شاعری اور انشائیہ کی مثلث ترتیب دیتی ہیں۔ راقم کو انھیں ربع صدی سے زیادہ عرصے تک قریب و دور سے دیکھنے اور پڑھنے کا موقع ملا۔ اس دوران میں بارہا ان سے مکالمے ہوتے رہے ہماری باہمی دلچسپی کا موضوع ہمیشہ ادب رہا۔ لاہور آنے کے بعد ان سے تنقید اور جدید تنقیدی تصورات پر مکالمے ہونے لگے، جب ان پر راقم کی شعری جہت منکشف ہوئی تو پھر ہماری گفتگوؤں کا مستقل موضوع نظم نگاری بنتا چلا گیا۔ راقم کو اپنے دورِ طالب علمی ہی سے ان کے ساتھ ملاقات کے مواقع میسر آنے لگے تھے، نوجوانی کی یہ عمر جس میں بہ قول وزیر آغا ''ہمارے پیش نظر مستقبل کا وسیع آسمان ہوتا ہے جس میں ہم اپنی آرزوؤں اور امنگوں کے پتنگ اور کنکوے اڑاتے ہیں''[۱] اس مرحلہ عمر میں اسے نوجوان نسل کے مسائل سے بہت دلچسپی تھی اور اس موضوع پر اس نے بعض

کتابیں بھی تحریر کر ڈالی تھیں اس لیے ابتدائی زمانے میں آغا صاحب سے بھی نوجوان نسل کے حوالے سے گفتگو رہی۔ یہی نہیں ان کے سوانحی احوال کی جستجو اور ان کی ذاتی زندگی کے حوالے سے بھی سوال جواب کیے جاتے رہے۔ موقع کوئی بھی ہوتا ہماری گفتگو ادب ہی کے دوائر میں رہتی اور اس میں کبھی اس زمانے کی ادبی دھڑے بندی کا ذکر تک نہ ہوا حالانکہ اس زمانے میں دوسرے ادبی گروہ سے ان کے حامی ادبا کی ٹھنی رہتی تھی۔ ہم نے اصولی طور پر ادب میں دبستانوں کے وجود کی اہمیت یا نقصانات پر تو بات کی لیکن کبھی معاصر ادبی سیاست بیچ میں نہیں آئی۔ مجھے یاد ہے کہ میری شادی کی تقریب میں بھی، جب وہ میرے ساتھ بیٹھے تھے اور ارد گرد دوسرے مہمان بھی تشریف فرما تھے، جن میں متعدد ادبی شخصیات شامل تھیں، مجید امجد کی شاعری اور زندگی کی ہماہمی میں مشکل شاعری کے مستقبل پر بات ہو رہی تھی۔ لاہور آ جانے کے بعد ان کے ساتھ ہونے والی ملاقاتوں میں سرگودھا جیسا تسلسل تو نہ رہا البتہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ جب لاہور آئیں تو ان سے ملاقات کی جائے۔ میں جب ایچی سن کالج میں پڑھاتا تھا تو اس زمانے میں ٹیلی فون اتنے عام نہ تھے۔ کالج کی ایکسچینج کے نمبر پر فون کر کے ایکسٹینشن لینا ہوتی تھی، ایکسٹینشن میرے ہاسٹل میں تھی جس کا میں منتظم تھا۔ اس پر فون آنے کی مجھے اطلاع دی جاتی تو میں اپنی رہائش سے آ کر فون سنا کرتا تھا۔ فون کرنے والا اس دوران ریسیور پکڑے انتظار کیا کرتا، یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک میں نے اپنا الگ فون نمبر حاصل نہیں کر لیا، آغا صاحب از رہِ کرم یہ تمام مراحل طے کر کے مجھے اپنی لاہور آمد کی اطلاع دیا کرتے تھے، اسی طرح دوسری رہائش گاہوں پر بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں لوگ الا ماشاء اللہ گفتگو کے لیے سیاست اور ذاتیات سے بڑھ کر کسی موضوع سے آشنا نہ ہوں آغا صاحب ہمیشہ ادب پر بات کرنے کے خواہش مند رہتے تھے۔ ان کی محفل میں شاعری، ادبی تھیوری، نئی تنقید، جدید سائنسی تحقیقات ہی زیر بحث رہا کرتی تھیں۔ انھوں نے اگرچہ تنقید اور انشائیے کی دنیا میں اَن مٹ نقوش چھوڑے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ سمجھتے تھے کہ شعر کہنا ان کی بنیادی ضرورت ہے، ان کے بہ قول ''شعر کہنا میری ایک نفسیاتی ضرورت ہے مجھے کئی بار اس بات کا احساس ہوا ہے کہ اگر میں شعر نہیں کہوں گا تو بیمار پڑ جاؤں گا دوسرے مجھے اپنے اندر کی شکست و ریخت یا تعمیر و تشکیل کا اندازہ بھی اپنے کلام ہی سے ہوتا ہے اور میں اپنے آپ کو بہتر طور پر سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہوں'' [۳] وہ نظم پر بہت محنت کی ضرورت پر زور دیا کرتے تھے اور معاصرین کی نظم کو اس پیمانے سے دیکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے جب ڈاکٹر سہیل احمد خان صاحب کا دوسرا شعری مجموعہ راہ کی نشانیاں شائع ہوا۔ سہیل صاحب نے ۳ ستمبر ۲۰۰۱ء کو اس کا ایک نسخہ اپنے ابتدائی کلمات کے ساتھ راقم کو عنایت کرتے ہوئے آغا صاحب کا نسخہ بھی اس کے سپرد کر دیا۔ ملاقات پر جب یہ امانت آغا صاحب تک پہنچائی گئی تو انھوں نے اسی وقت یہاں وہاں سے کئی نظموں کا مطالعہ کیا۔ مجموعہ مختصر تھا اور نظمیں مختصر تر اس لیے ایک ہی نشست میں اس کا بڑا حصہ دیکھ لیا اور تجزیہ کر کے یہ ظاہر کیا کہ مزید محنت کس طرح نظموں کو چمکا سکتی ہے۔

اپنی شاعری کے بارے میں وہ بہت حساس بھی تھے۔ ایک بار ایک بے تکلف محفل میں جب وہ بڑے

شوق سے ہمیں اپنی شاعری سنا رہے تھے، پروفیسر غلام جیلانی اصغر کے بے دریغ اور تابڑ توڑ تنقیدی جملوں بلکہ حملوں سے وہ ناراض ہو گئے اور انھوں نے یہ کہتے ہوئے بیاض بند کر دی کہ کسی بات کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔ جیلانی صاحب اٹھ کر محفل سے جانے لگے تاہم راقم نے انھیں روک لیا، اس روز صورتِ حال پریشان کن حد تک نازک ہو گئی تھی اور یہی دن تھا جب ان سطور کے راقم پر نظم ''یہ سب کیا ہے'' وارد ہوئی۔

لاہور آنے کے بعد ان سے خط کتابت بھی رہی۔ آئندہ سطور میں ان کی جانب سے راقم کو لکھے گئے خطوط پیش کیے جا رہے ہیں۔ جتنے طویل عرصے تک ان سے تعلق رہا اسے پیش نظر رکھیں تو ان کے خطوط کی تعداد خاصی زیادہ ہونی چاہیے تھی لیکن طویل عرصہ تک سرگودھا میں مقیم رہنے کے باعث ہمارے درمیان مراسلت اس وقت ہوئی جب میں سرگودھا سے لاہور آ گیا بلکہ ان کے دستیاب خطوط کو دیکھیں تو ان کا پہلا خط راقم کے لاہور آنے کے بھی سات برس بعد کا ہے۔ ہوسکتا ہے کچھ خطوط محفوظ نہ رہے ہوں۔ جس قدر خطوط دستیاب ہیں وہ مکتوب الیہ کے ساتھ ان کے اخلاص کا مظہر ہیں۔ ان میں بار بار ملاقات کی خواہش کے اظہار سے ان کی کشادہ ظرفی، زندگی اور دوستوں میں دل چسپی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ کبھی تو مطالبہ کرتے ہیں کہ لاہور میں اپنا ٹیلی فون نمبر بتا دیں تا کہ رابطہ ہو سکے۔ کبھی اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ ''سرگودھا جلدی جلدی آیا کریں''، کبھی لکھتے ہیں کہ ''آپ مجھے اپنا ایڈریس اور ٹیلی فون نمبر لکھ بھیجیں تا کہ جب لاہور پہنچوں تو آپ کو مطلع کر سکوں''، کبھی لکھتے ہیں: ''میرا جی چاہتا ہے کہ کسی دن مل بیٹھیں تا کہ جدید نظم پر آپ سے کچھ باتیں ہو سکیں۔ پچھلی بار آپ سے ملاقات ہی نہ ہو سکی۔ اس سے پہلے بھی میں ایک روز اورینٹل کالج گیا مگر آپ موجود نہیں تھے''، کبھی اپنے پروگرام سے آگاہ کر کے ملاقات کی خواہش یوں ظاہر کرتے ہیں کہ ''.....میرا ارادہ لاہور جانے کا ہے.....لاہور میں قیام رہے گا.....مگر آپ کو تو ہر شام مرید کے جانا ہوتا ہے، اس لیے ملاقات کیسے ہوگی؟ سوچ رہا ہوں''.....

ان کا خیال تھا کہ ''مسرت کا حصول احساسِ تنہائی کو مفلوج کرنے اور دوسرے افراد سے قریب تر ہونے ہی میں پنہاں ہے''[۲] ایک ادیب اور فن کار ہونے کے ناتے وہ مکتوب الیہ کی شاعری میں گہری دل چسپی لیتے دکھائی دیتے ہیں، بلند الفاظ میں اسے سراہتے ہیں اور اس کے فن پر بے جھجک اپنی رائے دیتے ہیں۔ شہر کی کسی تقریب میں شرکت کرنے پر ان کی نگاہیں مکتوب الیہ کو تلاش کرتی ہیں اور اس کے غیاب پر خط لکھ کر وہ اسے اپنی تلاش سے آگاہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے مکتوب الیہ کی کتاب کی اشاعت اور علمی کامیابیوں پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں مزید ترقیوں کی تمنا ظاہر کرتے ہیں۔ اپنی سرگرمیوں اور دل چسپیوں سے آگاہ کرتے ہیں ملاقات کے لیے خورد نوازی کرتے ہوئے اس کے ہاں تشریف لاتے ہیں اور راستے کی دشواریوں کو دور کرنے کے خواہشمند دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی ایک خواہش یہ بھی ہے کہ ان کی شاعری پر بات کی جائے اور ایسی ملاقات ہو جس میں فقط وہ اور مکتوب الیہ ہوں اور موضوعِ سخن ان کی شاعری ہو۔ ایسی ملاقات کو وہ اپنی نظموں کی ایک نئی قرات قرار دیتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے رسالے اوراق کے ہر شمارے میں مکتوب الیہ کی کوئی نظم شائع ہو، اشاعت کے لیے بھیجی جانے والی نظموں کو بہت

غور سے دیکھتے اور اپنے شعری تصورات کے مطابق شاعر کو مشورے بھی دیتے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان مدیروں ایسے مدیر نہیں ہیں جو صرف پوسٹ ماسٹر کا کردار ادا کرتے ہیں بلکہ وہ ایک ادبی جریدے کے ہوش مند اور باریک بین مدیر ہیں جو اپنی زیر ادارت شائع ہونے والی تخلیقات کو پہلے خود عمیق نگاہی سے دیکھتا ہے۔ نظموں کی ایک ایک لائن کو دیکھ کر اس پر اظہار خیال کرنا اور مشورہ دینا ان کے طرز ادارت کا اچھا نمونہ پیش کرتا ہے۔ وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ نظم کا اختتام کن الفاظ پر ہو رہا ہے اور کہتے ہیں کہ آخری لائن پر نظم کے تاثر کا تمام و کمال انحصار ہوتا ہے۔ ایسی باریک نگاہی کے ساتھ دیے گئے مشورے کو محض اپنی رائے قرار دے کر شاعر کی آزادی کو برقرار بھی رکھتے ہیں۔ ان سے ملاقات رکھنے والوں کو معلوم ہے کہ ان کے ہاں اچھی حس مزاح پائی جاتی تھی ان خطوط میں بھی ان کی حس مزاح کا اظہار ہوا ہے جہاں وہ ایک صدی سے زیادہ عرصے سے انارکلی میں قائم اورینٹل کالج کو نیو کیمپس لے جانے کو ''چھوٹا سا کام'' بتاتے ہیں جس کے نتیجے میں اساتذہ اور طلبا کی صحت پر بھی اچھا اثر مرتب ہوگا۔ یہ تجویز وہ شہر میں ٹریفک کے گمبھیر مسئلے کے پیش نظر دے رہے ہیں جس کے نتیجے میں ان کے مطابق اورینٹل کالج پہنچنا پہاڑ کاٹنے کا عمل دکھائی دینے لگا ہے۔ اس طرح ان چند خطوط سے ان کی مکتوب نگاری کا جو تاثر ابھرتا ہے وہ بہت خوش گوار اور مثبت ہے۔ ان کے خطوط بہ قول انور سدید ''سجل خوابوں اور کومل آرزوؤں کی جلوہ آرائی کرتے ہیں، وہ خطوط میں ایسی محفل سجاتے ہیں جس میں وہ اور مکتوب الیہ دونو شرکت کر کے ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کرتے ہیں۔''[۴]

راقم کی جانب سے کیے گئے سوالات کا جواب بہت انہماک اور توجہ سے دیا گیا ہے۔ اجتماعی موضوعات پر ان کی فکر منظم دکھائی دیتی ہے، ذاتی زندگی کے حوالے سے کیے گئے سوالات پر ان کے جوابات میں بعض بہت اہم باتیں آ گئی ہیں۔ اپنی زندگی میں رہ جانے والی جس کمی کی نشان دہی انھوں نے کی ہے وہ ان کی شخصیت کے نفسیاتی مطالعے کے لیے ایک اہم اساس فراہم کرتی ہے۔ اس کمزوری کا اظہار ایسی وضاحت سے شاید ان کی کسی اور تحریر میں نہیں آیا ہے۔ بعض نجی مکالموں میں البتہ اس کا اظہار ضرور ہوا کہ میرا بچپن اتنا غیر محفوظ اور جسم اتنا کمزور تھا کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی پچاس کے سن کو چھو سکوں گا۔ کبھی لطیف پیرائے میں یہ اظہار کیا کرتے تھے کہ میں ایک کمزور سا لڑکا تھا اب تو صحت ماشاء اللہ بہت اچھی ہے، خاص طور پر غلام جیلانی اصغر کو دیکھ کر ایک عجیب سا احساس برتری حاصل ہوتا ہے[۵] جن لوگوں نے ڈاکٹر وزیر آغا اور پروفیسر غلام جیلانی اصغر کو دیکھا ہے وہ اس جملے کا صحیح لطف لے سکتے ہیں کہ آغا صاحب دھان پان وجود کے حامل تھے، پروفیسر صاحب ان کے مقابلے میں بالکل ہی منحنی مشت استخوان تھے۔ ان کے وجود کے اختصار کے سامنے وزیر آغا جیسا دھان پان وجود بھی بھرا بھرا دکھائی دیتا تھا۔ زندگی کے اس لمحے کے بارے میں کیے گئے سوال پر جسے انھوں نے امر کرنا چاہا ہو، ان کے جواب سے ان کی ایک نظم کا پس منظر بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ اس نظم کا زمانہ تخلیق وہ ہے جب انھوں نے اپنی زندگی کی پہلی کتاب مسرت کی تلاش لکھی تھی۔ اس سوال کے جواب میں انھوں نے سوا سالہ بیٹی کے معصومانہ قہقہے کو مسرت کی تلاش کا دیباچہ قرار دیا ہے دلچسپ بات یہ ہے کہ مسرت کی تلاش پر مولانا صلاح الدین احمد کا پیش لفظ اور وجیہہ الدین احمد کا مقدمہ تو ہے لیکن

مصنف کا کوئی دیباچہ نہیں ہے۔ کم سن بیٹی کے معصومانہ قہقہے نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ سچ ہے ؎

خوشی، خالص خوشی بچوں کے سادہ دل میں رہتی ہے
یہ لیلائے حیات افروز اس محمل میں رہتی ہے

احمد ندیم قاسمی صاحب مرحوم کے ساتھ ان کے اختلاف کو یار لوگوں نے کچھ زیادہ ہی ہوا دی۔ جب بھی ان اختلافات کو ختم کرنے اور دونوں حضرات کو قریب لانے کی بات ہوئی، آغا صاحب نے اسے کھلے دل سے تسلیم کیا۔ ۱۹۷۱ء میں خود آغا صاحب کی روایت کے مطابق پشاور کی ایک ادبی تقریب میں جس میں یہ دونو حضرات موجود تھے، پروفیسر غلام جیلانی اصغر نے ایک تقریر کی کہ بعض غلط فہمیوں کے باعث ندیم صاحب اور وزیر آغا کے تعلقات میں خلل آ گیا ہے جو ان کے دوستوں اور اردو زبان کے بہی خواہوں کے لیے کرب کا باعث ہے، محفل میں موجود کچھ اور دوستوں نے بھی تائید کی اور کہا کہ یہ صورت حال ختم ہونی چاہیے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب نے بھی اس بات سے اتفاق کیا اور کہا کہ اس بات پر انھیں قطعاً کوئی اعتراض نہیں۔ ندیم صاحب کے اس فراخ دلانہ رویے پر سب کی نگاہیں وزیر آغا کی طرف اٹھیں تو انھوں نے بھی گزشت آنچہ گزشت کہہ کر اس معارضے کو ختم کر دیا اور جانبین کے فاصلے ختم ہو گئے لیکن کچھ عرصے بعد دوبارہ غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ ایک بار جمیل یوسف صاحب کی دعوت پر ندیم صاحب سرگودھا آئے تو پھر ایسی ہی کوشش کی گئی۔ آغا صاحب بھی مان گئے لیکن بدقسمتی سے یہ خوش گوار کیفیت بھی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ اصل میں دونو طرف کے میمنے اور میسرے سلجھاؤ نہیں چاہتے تھے۔ آخری بات جس کا میں عینی شاہد ہوں وہ ندیم صاحب کے انتقال کا حادثہ تھا جس پر آغا صاحب سب سے پہلے ان کی رہائش پر پہنچنے والوں میں تھے۔ مجھے وہاں دیکھ کر بے ساختہ میری جانب لپکے اور ندیم صاحب کی رحلت پر اپنے دلی جذبات تاسف کا اظہار کرتے رہے۔ اس روز وہ بہت رنجیدہ تھے۔

ہر فن کار کو اپنے کاموں میں سے کچھ چیزیں زیادہ پسند ہوتی ہیں یا وہ موقع محل کی مناسبت سے ان کا انتخاب کرتا ہے۔ راقم کی جانب سے کالج میگزین کے لیے کسی انشائیے کا مطالبہ کرنے پر انھوں نے اپنا انشائیہ ''ریلوے ٹائم ٹیبل'' عنایت کیا۔ وہ ایک پرگو شاعر تھے جس پر ان کے شعری مجموعے شاہد ہیں جو ان کی تنقید نگاری اور انشائیہ نگاری پر مستزاد ہیں۔ ہر شاعر کی طرح انھیں بھی اپنے کلام میں بعض چیزیں ایسی پسند تھیں کہ وہ اکثر محافل میں سنانے کے لیے انھی میں سے انتخاب کیا کرتے تھے مثال کے طور پر ان کی غزل.....

سکھا دیا ہے زمانے نے بے بصر رہنا
خبر کی آنچ میں جل کر بھی بے خبر رہنا

یا پھر ایک اور غزل

جبین سنگ پہ لکھا مرا فسانہ گیا
میں رہگزر تھا مجھے روند کر زمانہ گیا

وہ اکثر سنایا کرتے تھے۔ ایک بار، راقم نے ان سے ان کے دو پسندیدہ شعروں کی فرمائش کی تو انھوں نے اسے جو دو شعر لکھ کر دیے وہ بھی ایک ایسی غزل کے تھے جسے وہ عام طور سے محفلوں میں سنانا پسند کرتے تھے یہ دو اشعار تھے ؎

دھوپ کے ساتھ گیا ساتھ نبھانے والا
اب کہاں آئے گا وہ لوٹ کے آنے والا
ریت پر چھوڑ گیا نقش ہزاروں اپنے
کسی پاگل کی طرح نقش مٹانے والا

نظموں میں وہ بالعموم ''ساون کا آخری دن'' یا ''دُعا'' سنایا کرتے تھے۔ راقم کی جانب سے ایک نظم لکھ کر دینے کی فرمائش پر انھوں نے اپنے دست خط میں یہ نظم لکھ کر دی:

شاعر
وحشی لفظوں کے جنگل میں
وہ اِک ڈرا ہوا ساحر ہے
چادر اس کی خون میں لت پت
اور بدن زخموں کا گھر ہے
کہاں سدھارے؟ رستے گم ہیں
کسے پکارے؟ اندھیارا ہے
ہر جانب آواز اُگی ہے
ہر ٹہنی پر میلی آنکھیں
کالے موٹے لب لٹکے ہیں
سر پر تاروں کا چھتا ہے
وحشی لفظوں کے جنگل میں
وہ اِک ڈرا ہوا ساحر ہے
اور اس کی مخلوق یہ بونے
لفظوں کے خود کار کھلونے
لے کر اِک گھیرے میں اس کو
اک خونی نرغے میں اس کو
توڑ کے سارے بچن پرانے

ناچ رہے ہیں نیزے تانے

﴿1﴾

۵۸/سول لائنز سرگودھا

۶/جون ۹۶ء

عزیزم زاہد منیر عامر السلام علیکم!

آپ نے بہت اچھا کیا کہ اپنی نظم بروقت بھیج دی۔ خوبصورت تخلیق ہے۔ اسے اوراق میں شامل کر رہا ہوں۔ آپ نظم نگاری پر زیادہ توجہ مبذول کریں۔ آپ کے ہاں ڈکشن بھی بہت عمدہ ہے اور امیجز بھی تر و تازہ ہیں۔ مثلاً پت جھڑ کے پتوں کی چھنا چھن کو زَمہریری رقص کے پائل کی آواز قرار دینا، ایک بالکل تازہ امیج[۶] ہے۔

میرا جی چاہتا ہے کہ کسی دن مل بیٹھیں تا کہ جدید نظم پر آپ سے کچھ باتیں ہو سکیں۔ پچھلی بار آپ سے ملاقات ہی نہ ہو سکی۔ اس سے پہلے بھی میں ایک روز اورینٹل کالج گیا مگر آپ موجود نہیں تھے۔

آپ مجھے اپنا ایڈریس اور ٹیلی فون نمبر لکھ بھیجیں تا کہ جب لاہور پہنچوں تو آپ کو مطلع کر سکوں۔

والسلام

مخلص

وزیر آغا

﴿2﴾

۳۰/نومبر ۹۷ء

محترم زاہد منیر عامر صاحب السلام علیکم!

آپ کا خط ملا۔ نظم ''محبت آزمائیں گے'' اوراق کے لیے محفوظ کر لی ہے[۷] شکریہ۔

بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے ''عجب اک مسکراہٹ''[۸] کو اپنا ہم سفر بنایا اور اس کی رفاقت سے سکون پایا۔ ایک شاعر کو اور کیا چاہیے اگر اس کے کلام نے ایک صاحب نظر کو اس طور متاثر کر لیا ہو۔ مگر میں آپ کے تاثرات ذرا تفصیل سے سننا یا پڑھنا چاہتا ہوں۔ یہ ایک طرح سے اپنی ہی نظموں کی ایک نئی قرات ہوگی جس میں آپ اور میں دونوں شریک ہوں گے۔

میں لاہور گیا تھا۔ فرخندہ لودھی[۹] کی کتاب کی تقریب رونمائی گورنمنٹ کالج لاہور میں تھی۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان[۱۰] آئے تھے مگر آپ نظر نہیں آئے۔ آ جاتے تو ملاقات ہو جاتی۔

والسلام

مخلص

وزیر آغا

﴿3﴾

۲۲ر ستمبر ۹۸ء

محترمی زاہد منیر عامر صاحب السلام علیکم

افسوس کہ آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میں ۲۰ر کو سرگودھا پہنچا۔ عموماً اتوار کو سرگودھا آتا ہوں۔ اس وقت آپ جا چکے تھے۔ البتہ ٹیلی ویژن سکرین پر آپ سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔

اوراق آپ کو بھجوا دیا تھا مگر اس میں آپ کی کوئی نظم نہیں تھی۔ آپ اچھی نظم لکھتے ہیں اوراق کے ہر شمارے میں آپ کی نظم آنی چاہیے۔

فرستادہ نظم ''مجھے جلدی بہت تھی'' بھی اچھی نظم ہے۔ بس اس میں ایک ترکیب ''سر راہِ تمنا'' نظم کے اسلوب سے ہٹی ہوئی دکھائی دی ہے۔ غزل میں تو ایسی تراکیب سما جاتی ہیں مگر جدید نظم میں اجنبی لگتی ہیں۔[۱۱] اس پر غور کر لیجیے۔

سر راہ کافی تھا۔ اس کے ساتھ تمنا کو منسلک نہ بھی کیا جائے تو کوئی ہرج نہیں نظم کی آخری لائن پر بھی غور کر لیں کیونکہ آخری لائن پر نظم کے تاثر کا تمام و کمال انحصار ہوتا ہے۔ آپ ''مجھے کس بات کی جلدی تھی اتنی'' کہنا چاہتے ہیں ''مگر کس بات'' اور ''بہت'' کے اشتراک سے وہ تاثر نہیں ابھرا جو درکار تھا دیکھ لیجیے اگر کچھ کر سکیں تو ٹھیک ہے ورنہ ٹھیک ہے۔[۱۲]

لاہور میں اپنا ٹیلی فون نمبر بتا دیں تا کہ رابطہ ہو سکے۔ سرگودھا بھی جلدی جلدی آیا کریں۔

والسلام

مخلص

وزیر آغا

﴿4﴾

ریلوے روڈ سرگودھا

۲۲ر نومبر ۹۸ء

محترمی زاہد منیر عامر صاحب السلام علیکم

آپ کا خط مل گیا ہے۔ شکریہ! میں آپ کے خط کی روشنی میں نظم کی چند لائنوں میں تبدیلی کر دوں گا۔[۱۳]

آپ سے ملاقات نہیں ہو رہی۔ آپ سرگودھا نہیں آ سکے اور میں لاہور جانے کے باوجود اورینٹل کالج نہیں پہنچ سکا۔ دراصل اب ٹریفک کا مسئلہ اتنا گھمبیر ہو گیا ہے کہ اورینٹل کالج پہنچنا پہاڑ کاٹنے کا عمل دکھائی دے رہا ہے۔ آپ ایک چھوٹا سا کام کریں۔ محترم سہیل احمد خاں صاحب سے مشورہ کر کے اورینٹل کالج کو نیو کیمپس لے جائیں سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ کھلی فضا میں آنے سے اورینٹل کالج کے اساتذہ نیز کالج کے طلبا کی صحت

بھی بہتر ہو جائے گی۔[۱۴]

میرا ارادہ ۲۶ نومبر کو لاہور جانے کا ہے۔ ۲۷/۲۸ کو لاہور میں قیام رہے گا۔ مگر آپ کو تو ہر شام مرید کے جانا ہوتا ہے۔[۱۵] اس لیے ملاقات کیسے ہوگی؟ سوچ رہا ہوں۔

والسلام

مخلص

وزیر آغا

﴿5﴾

۲۰ مئی ۲۰۰۰ء

محترمی زاہد منیر عامر صاحب السلام

میں چند تقاریب کے سلسلے میں پنڈی اسلام آباد چلا گیا تھا۔ اس لیے آپ کے خط کا جواب نہ دے سکا۔ بے حد خوشی ہوئی کہ آپ کو ڈاکٹریٹ مل گئی ہے۔ مبارکباد![۱۶]

آپ نے اچھا کیا کہ مقالے کا ''مقدمہ'' شائع کر دیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مقالہ کس محنت اور عرق ریزی سے لکھا گیا ہوگا۔[۱۷]

خدا کرے آپ اسی طرح آگے ہی آگے بڑھتے جائیں۔

اس وقت ''عارفہ اقبال'' کی نظم[۱۸] ذہن میں نہیں.....۔ اگر اوراق کے لیے قبول کر لی گئی ہے تو مضامین کے تھیلے میں ہوگی۔ تاہم ازراہ احتیاط اس کی دو تین نقلیں مجھے بھیج دیجیے۔

والسلام

مخلص

وزیر آغا

﴿6﴾

محترمی زاہد منیر عامر صاحب السلام علیکم

[۱۹] فلیپ حاضر ہے۔ ملنے کی اطلاع بذریعہ ٹیلی فون دیں ممنون ہوں گا۔

والسلام

مخلص

وزیر آغا

زاہد منیر عامر کی نظموں میں موضوعات کا تنوع ہے۔ اُس نے سامنے کی گری پڑی چیزوں سے لے کر آسمان کے لطیف ترین ابعاد تک کو اپنی نظموں میں پیش کیا ہے لیکن محسوس یہ ہوتا ہے کہ ''محبت'' اس کا عزیز ترین

موضوع ہے۔ یہ محبت خالص رومانی پیرایے میں بھی موجود ہے جہاں چمن کی علامات .....صبا اور پھول اور خوش بُو نے اسے واردات بنا کر پیش کر دیا ہے اور ارض سے ماورا اسفھا میں بھی جہاں وہ تجرید کے مہین لباس میں اس طور پر نمودار ہوئی ہے کہ صرف حساس اذہان ہی اس کے اَنت کو پا سکتے ہیں۔ آخر آخر میں محبت نے اپنے مقدس روپ میں خود کو آشکار کیا ہے جب وہ مامتا کے روپ میں ابھر کر زمان و مکان پر محیط ہو گئی ہے۔ میری دعا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنی نظم کے آفاق کو دائرہ در دائرہ پھیلانے میں کامیاب ہوں اور ''کہانی نے .....''[۲۰] کے پایے کی نظموں کے ڈھیر لگا دیں۔

وزیر آغا

﴿7﴾

[۲۱] زاہد منیر عامر ہمارے ان نوجوان ادبا میں سے ہیں جن کے ہاں نہ صرف ادب کی ایک سچی لگن موجود ہے بلکہ جو فکر و نظر کی سطح پر بھی ہمہ وقت متجسّس دکھائی دیتے ہیں اور یہ اسی تجسّس کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے ایسے موضوعات کے بارے میں سوچ بچار کا آغاز کیا ہے جو فی زمانہ (کم از کم ہمارے وطنِ عزیز کی حد تک) نوجوان تو ایک طرف، پختہ عمر لوگوں کے ہاں بھی ٹیبو قرار پائے ہیں۔ مثلاً زیرِ نظر کتابچے ہی کو لیجیے۔ اس میں زاہد منیر عامر نے ''لمحۂ موجود'' کے علاوہ ''اپنی نظر'' یعنی انسان کے منفرد زاویہ نگاہ کی اہمیت کے بارے میں بھی غور و خوض کیا ہے۔ لمحہ موجود کے بارے میں ن۔م۔ راشد نے ایک بہت خوبصورت نظم لکھی تھی جس میں اس بات کا اظہار کیا تھا کہ ازل اور ابد کے درمیان تنی ہوئی رسی میں ''لمحۂ موجود'' محض ایک گرہ ہے، جس کا مطلب یہ تھا کہ گرہ بجائے خود کوئی الگ وجود نہیں ہے بلکہ ماضی اور حال کا وہ مقامِ اتصال ہے جو ابھی تھا اور اب نہیں ہے۔ دھاگہ جب سوئی کے سوراخ میں سے گزرتا ہے تو وہ ایک لمحہ جب وہ اس کو مَس کرتا ہے لمحۂ موجود قرار پا سکتا ہے۔ تاہم لطف کی بات یہ ہے کہ یہی لمحۂ موجود جو بظاہر اس قدر مختصر ہے، اپنے اندر پورے ماضی اور مستقبل کو سمیٹے ہوئے ہے۔ برگساں نے اسے مرورِ زماں یعنی Duration کا نام دیا تھا۔ یعنی عرفان کا وہ لمحہ ہے جس میں سارے زمانے یکجا ہو جاتے ہیں۔ تخلیق کاری کے عمل میں بھی ''لمحہ موجود'' کو مَس کرنا ہی اصل بات ہے۔ وہ لوگ جو لمحۂ موجود سے مراد یہ لیتے ہیں کہ ماضی اور مستقبل سے بے نیاز ہو کر محض گزرتے ہوئے لمحے سے مسرت کشید کی جائے اصلاً ایک مادّی نقطۂ نظر کے موید ہیں۔ لمحۂ موجود کی اصل اہمیت اس بات میں ہے کہ انسان وقت کے سلاسل سے آزاد ہو کر اپنی بیکرانی اور ابدیت کو محسوس کرنے پر قادر ہو۔ زاہد منیر عامر قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس انتہائی زرخیز موضوع کو چھیڑا ہے۔ اُمید ہے وہ اس پر مزید غور و فکر کریں گے تاکہ آگے چل کر ان کی سوچ بچار کے اثمار ایک الگ کتاب کی صورت میں ہمارے سامنے آ سکیں۔ اپنے اس کتابچے کے دوسرے مضمون میں زاہد منیر عامر نے اس بات پر زور دیا ہے کہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر سیدھی سڑک پر چلنے سے انسان کی انفرادیت مسخ ہو جاتی ہے۔ انسان تو ایک محشر خیال ہے، ایک بے مثال ہستی ہے، لازم ہے کہ وہ اپنی اس انفرادیت کو اپنے کردار میں سمو دے۔ نہ یہ کہ ایک Type میں ڈھل

کر معاشرے کی مشین میں محض ایک پرزے کی طرح کام کرتا چلا جائے۔ علامہ اقبال نے خودی کی تکمیل اور دریافت پر اسی لیے زور دیا تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہمارے نوجوان لکیر کے فقیر بنے رہیں۔ اقبال کا فلسفہ خودی انا یا مجہول انا کی تعمیر کا نام نہیں ہے۔ اقبالؒ کی خودی تو عرفانِ ذات کا دوسرا نام ہے----- وہ عرفانِ ذات جس میں شخص اپنے سے باہر آ کر اپنا نظارہ کرتا ہے اور پھر خود کو مشین کا ایک پرزہ نہیں سمجھتا بلکہ پوری کائنات کے ایک نباض اور مفسر کی حیثیت میں پاتا ہے۔ اپنے اس مضمون میں بھی زاہد منیر عامر نے ہماری سوچ کو مہمیز لگائی ہے اور ایک انتہائی اہم موضوع کے ان گنت ابعاد میں اُترنے کی طرف ہمیں مائل کیا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ وہ اس موضوع کے سلسلے میں بھی سوچ بچار کے عمل کو جاری رکھیں گے اور پھر کیا عجب کہ آگے چل کر وہ اس موضوع پر بھی ایک کتاب لکھ سکیں۔ بہ ہر حال میں زاہد منیر عامر کے اس جذبہ سیاحت اور تجسّس کو قابل تعریف سمجھتا ہوں اور میری یہ دُعا ہے کہ انھوں نے اپنے اعماق میں جو شمع جلائی ہے وہ اسے اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی تعصّبات کی گم آندھی میں بجھنے نہیں دیں گے۔

۷/ مارچ ۱۹۸۹ء

وزیر آغا

﴿8﴾

سوالات

س: آپ کی نظر میں ہماری نوجوان نسل کے فکری انتشار کا سبب کیا ہے؟

ج: آپ جس صورتِ حال کا ذکر کر رہے ہیں اسے فکری انتشار نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ جذبات کا تلاطم کہلاتا ہے جو اس عمر (نوجوانی) کا خاصہ ہے اور یہ ایسی پریشان ہونے والی بات نہیں ہے کیونکہ یہی نوجوان جب کل کو پختگی کی عمر میں پہنچیں گے اور ان پر ذمہ داریوں کا کوہِ گراں پڑے گا تو جذبات کا یہ تلاطم جسے آپ فکری انتشار کہہ رہے ہیں خود بخود درست ہو جائے گا۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ہماری نوجوان نسل اپنے پیش رووں کے مقابلہ میں کہیں (Well Informed) ہے۔ اس میں بڑی صلاحیتیں ہیں بس ذرا بات اتنی ہے کہ ان کے جذبات کے طوفان کو ترتیب دے کر تعمیری لائنوں پر لانے کی ضرورت ہے یہ ترتیب یا نمی مہیا کرنا والدین اور اساتذہ کا کام ہے۔

س: تو کیا آپ اس دور میں والدین اور اساتذہ کے کردار سے مطمئن ہیں؟

ج: اصل میں یہی تو چیز ہے جس سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اساتذہ اور والدین اگر اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے لگیں تو ساری نوجوان نسل [مثالی] ۲۲ نہ ہو جائے کیونکہ اسے تو صرف رہنمائی کی ضرورت ہے باقی صلاحیتیں اس میں سب موجود ہیں۔

بچے کی پہلی تربیت گاہ گھر اور والدین کا کردار ہوتا ہے اس کے بعد اس کے تعلیمی ادارہ کے اساتذہ اس کی زندگی پر گہرے نقوش مرتب کرتے ہیں اس طرح والدین، اساتذہ اور طلبا یہ ایک مثلث ہے جو انسانی معاشرے

کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرتی ہے مگر اس دور میں یہ مثلث بکھر گئی ہے، نہ تو والدین اپنی ذمہ داریوں کو پورا کر رہے ہیں اور نہ اساتذہ بلکہ یہ دونوں معاشرے کی ایک اجتماعی بیماری منافقت کا شکار بھی ہوتے ہیں۔ والدین یا اساتذہ بچوں کو جو نصیحت کرتے ہیں وہ جب تک خود اس پر عمل پیرا ہو کر نہیں دکھائیں گے تب تک وہ نصیحت بچوں پر کارگر نہیں ہوگی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بچوں کو نصیحتیں کم کی جائیں ان کے سامنے عملی صورت میں نمونے پیش کیے جائیں جو انھیں ایک اچھا انسان بننے میں مدد دیں گے۔ جب نوجوان اچھے انسان بن جائیں گے تو باقی صلاحیتیں ان میں خود بخود پیدا ہو جائیں گی۔

س: ان حالات کی روشنی میں آپ ہمارے مستقبل کو کیسا دیکھتے ہیں؟

ج: ان حالات سے ایک منطقی نتیجہ بہ آسانی نکالا جا سکتا ہے کہ اگر یہی صورت حال رہی اور والدین و اساتذہ نے اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہ کیا تو آئندہ نسل موپ (Mope) پیدا ہوگی جس کے پیش نظر سوائے مادیّت کے اور کوئی مقصدِ حیات نہیں ہوگا۔ اس کا حل یہ ہے کہ بچے جو کچی مٹی کی طرح ہوتے ہیں ان کی تربیت کی طرف بھرپور توجہ دی جائے تعلیمی اداروں میں ان کی تربیت کے لیے خاص انتظامات کیے جائیں اور اساتذہ کی تربیت کے لیے موسٹ ماڈرن کورسز (Most Modern Courses) تیار کیے جائیں کیونکہ اگر مٹی کا برتن اچھا نہ بنا ہوا ہو تو اس میں قصور مٹی کا نہیں بلکہ کمھار کا ہوتا ہے۔ اب بھی اگر اس طرف بھرپور توجہ دی جائے اور اس نسل کو جو میری نظر میں بڑی صلاحیتوں والی نسل ہے مناسب راہنمائی فراہم کی گئی تو مستقبل تاریک نہیں ہوگا۔ ان شاءاللہ ۲۳

ان سوالات کے جوابات سے آغا صاحب کی شخصیت کا مثبت اور تعمیری طرز فکر سامنے آتا ہے۔ یہ مکالمہ تو قومی موضوع پر تھا، آغا صاحب سے ذاتی حوالوں سے بھی گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ بہ ظاہر وہ اپنے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتے تھے لیکن بہ باطن وہ ایک خلیق اور مہربان شخصیت کے مالک تھے جو ہر آنے والے سے مسکرا کر ملنے اور ہر طالب علم کے سوالات کا جواب دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ ایک بار راقم نے ان سے ان کی ذاتی زندگی کے حوالے سے کچھ سوالات دریافت کیے تو انھوں نے ان پر بھی بڑی دلجمعی اور توجہ کے ساتھ جوابات عنایت کیے یہ سوال اور ان کے جواب اس طرح سے تھے:

﴿9﴾

سوال: کیا آپ اپنے اسلوبِ حیات سے مطمئن ہیں؟

جواب: جی ہاں بالکل مطمئن ہوں۔

سوال: کوئی ایسی کمی جو زندگی میں آپ کو شدت سے محسوس ہوئی ہو؟

جواب میں ایک کم زور جسم کے ساتھ تو پیدا نہیں ہوا تھا لیکن پانچ برس کی عمر میں مجھ پر ٹائیفائڈ کا حملہ ہوا۔ ان دنوں ٹائیفائیڈ کا کوئی علاج نہیں تھا بجز اس کے کہ ڈاکٹر بخار کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کرتا اور ماں دن رات سجدے میں گری رہتی۔ میں ٹائیفائڈ سے تو بچ گیا لیکن اس کے اثرات باقی رہے۔ چنانچہ جسم نارمل انداز میں بڑھ نہ

سکا۔ ہڈیاں کم زور رہ گئیں۔ میں نے سکول اور کالج کے ایّام میں کھیلوں میں حصہ لیا، ورزش بھی کی مگر جسم سکڑا سمٹا ہی رہا۔ اس کمی کا مجھے تمام عمر شدت سے احساس رہا ہے۔ قدرت نے اس کی تلافی ضرور کی اور میں علمی و ادبی میدانوں میں خاصا فعال رہا لیکن اس کمی نے مجھے ہمیشہ بہت دکھ دیا کہ مجھے ایسا جسم کیوں نہ ملا جو مجھے قوت اور تحفظ عطا کرتا۔

سوال: زندگی میں کوئی ایسا لمحہ جسے آپ نے امر کرنے کی کوشش کی ہو۔

جواب: یہ آج سے کم و بیش چھتیس برس پہلے کی بات ہے۔ اس وقت میری بیٹی کی عمر سوا سال کے لگ بھگ ہوگی۔ سردیوں کے دن تھے۔ میں صبح سویرے اپنے بستر میں جاگ رہا تھا۔ چاروں طرف مکمل سکوت تھا اور پھر اس سکوت میں مجھے ایک ننھے سے قہقہے کی آواز سنائی دی بالکل جیسے مندر میں گھنٹی بج اٹھی ہو۔ میں نے اپنی بیوی کو آواز دی اور پوچھا: ''یہ کون ہنسا؟'' میری بیوی ہنسی اور کہا: ''یہ مینا تھی'' (ہم اپنی بیٹی کو پیار سے مینا کہا کرتے تھے) مجھے محسوس ہوا کہ میں تو ایسے ہی زندگی بھر مسرت کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔ مسرت تو معصومیت میں لپٹی ہوئی اس ننھی منی ہنسی کا نام ہے جو بے انت کائنات کے مقابلے میں ایک متوازی قوت کے روپ میں ابھر آتی ہے۔ یکا یک مجھے محسوس ہوا جیسے میری کتاب مسرت کی تلاش ۲۴ پر اصل دیباچہ تو مینا نے لکھا ہے۔ بس اس لمحے میری کتاب (ان دنوں میری کتاب مسرت کی تلاش تازہ تازہ شائع ہوئی تھی) اور مینا کا قہقہہ ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو گئے اور میں مسرت کے ایک گہرے احساس کو دبائے بستر سے نکل کر باہر مردانے کی طرف تقریباً بھاگتے ہوئے گیا۔ وہاں پہنچتے ہی میں نے اپنا نیلا پیڈ نکالا اور مسرت کے اس روشن لمحے کو امر کرنے کی کوشش کی: نتیجہ ایک نظم کی صورت میں آج بھی میرے سامنے ہے: نظم درج ذیل ہے:

نقرئی سکّوں میں ڈھلتے ہوئے یہ شام و سحر
ایک بے نور اداسی کی گپھا میں چپ چاپ
نرم بوندوں کی طرح گرتے چلے جاتے تھے

☆

ہر نئی شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں
اک ستارہ ابھر آتا تھا فلک پر چپ چاپ
دو ستارے مری آنکھوں میں بھی لہراتے تھے

☆

ہر شبِ تیرہ کے انجام پہ دونوں آنسو
میری آنکھوں کے جھروکوں سے نکل کر چپ چاپ
میرے گالوں پہ لڑھکتے ہوئے کھو جاتے تھے

☆

آج میں اک نئی چہکار سے جاگ اُٹھا ہوں
قہقہہ.....ننھی سی گڑیا کا در آیا چپ چاپ
اور میں خوابِ گراں بار سے جاگ اُٹھا ہوں

حوالہ جات:

۱۔ وزیر آغا، مسرت کی تلاش، (لاہور: اظہار سنز، ۲۰۱۲ء)، ص: ۳۱
۲۔ ایضاً، ص: ۱۱۵
۳۔ مکتوب ڈاکٹر وزیر آغا مرقومہ ۱۴/مارچ ۱۹۷۹ء بنام انور سدید مشمولہ وزیر آغا کے خطوط انور سدید کے نام، لاہور: مکتبہ فکر و خیال، ۱۹۸۵ء)، ص: ۱۲۲
۴۔ وزیر آغا کے خطوط، ص: ۳۰
۵۔ ایضاً، مکتوب ڈاکٹر وزیر آغا مرقومہ ۶/ستمبر ۱۹۸۱ء، ص: ۱۸۹
۶۔ راقم کی نظم ''ابھی آؤ'' کی طرف اشارہ ہے جو آغا صاحب کے رسالے اوراق کے خاص نمبر جولائی اگست ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی، ص: ۸۴
۷۔ محبت آزمائیں گے سالنامہ اوراق، جنوری فروری ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئی، ص: ۱۲۵
۸۔ عجب اک مسکراہٹ آغا صاحب کے شعری مجموعے کا نام ہے، (سرگودھا: مکتبہ اُردو زبان مارچ، ۱۹۹۷ء)
۹۔ فرخندہ لودھی (م: مئی ۲۰۱۰ء) اُردو اور پنجابی کی افسانہ نگار اور ناول نگار تھیں مدت العمر گورنمنٹ کالج لاہور میں چیف لائبریرین کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ان کے شوہر اور سدا کے ہنس مکھ پروفیسر صابر لودھی اور فرخندہ صاحبہ دونو سے ڈاکٹر وزیر آغا کے بہت اچھے مراسم تھے۔
۱۰۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان (۱۹۴۸ء.....۲۰۰۹ء) ممتاز نقاد، شاعر اور استادِ ادبیاتِ اُردو، اورینٹل کالج میں صدر شعبۂ اُردو تھے، پرنسپل اورینٹل کالج بھی رہے، بعد ازاں گورنمنٹ کالج لاہور چلے گئے جہاں صدر شعبہ اور ڈین کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ تفصیل کے لیے راقم کا مضمون ''ڈاکٹر سہیل احمد خان .....اپنے بھیدوں کی حد میں لامحدود'' ملاحظہ کیا جا سکتا ہے ماہنامہ قومی زبان کراچی، جون ۲۰۰۹ء
۱۱۔ آغا صاحب بجا طور پر نئی نظم میں اضافتوں کو پسند نہیں کرتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ اظہار کے لیے مرکب اضافی سے مدد لینا غزل کا مزاج رہا ہے۔ نئی نظم کو اس سے بچنا چاہیے چنانچہ انھوں نے راقم کی نظم میں در آنے والی ترکیب کے بارے میں یہ اظہار رائے فرمایا۔
۱۲۔ نظم میں تبدیلی کر دی گئی اور سرراہ تمنا کو ''سررہ'' سے بدل دیا گیا۔ آغا صاحب کو اس تبدیلی کی اطلاع دی گئی

جس پر انھوں نے یہ تحریر فرمایا۔ یہ نظم اوراق کے سالنامے جنوری فروری ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی، ص: ۲۲۰

۱۳۔ پوری نظم درج ذیل ہے:

مجھے جلدی بہت تھی
اس لیے جملے بھٹکتے تھے
بہت سے لفظ باتوں میں
نشست اپنی بدلتے تھے
بہت سرگوشیاں میری سماعت پر اترتی تھیں
سماعت سے زرا آگے مگر جلدی کا پہرا تھا
میں سنتا تھا پہ بہرا تھا
سرہ ریختہ پتوں کو سننے
مسکراتے پھول چننے
یا نشیلے بادلوں کو دیکھنے
کی بھی زرا فرصت نہیں تھی.....
بہت دن سے سدا کل پر اٹھا رکھے ہوئے سپنے
یہ آوازیں، یہ نظارے
ضروری کام یہ سارے
بالآخر راستے میں آ ملے ہیں
سوچتا ہوں کیوں مجھے جلدی کا سودا تھا.....؟

۱۴۔ آغا صاحب نے جو بات لطیف پیرائے میں کہی وہ ایک سنجیدہ تجویز کی حیثیت رکھتی ہے ایک عرصے سے اورینٹل کالج کو نیو کیمپس منتقل کرنے کی تجویز دی جا رہی ہے لیکن پنجاب یونی ورسٹی کا بڑا حصہ نیو کیمپس منتقل ہو جانے کے باوصف اورینٹل کالج ہنوز اپنی پرانی عمارت اور پرانے کیمپس ہی میں واقع ہے۔

۱۵۔ اس زمانے میں راقم کا قیام لاہور کی مضافاتی بستی، مرید کے میں تھا تدریسی فرائض کی انجام دہی کے لیے وہاں سے روزانہ یونی ورسٹی آتا اور کلاس پڑھا کر مرید کے لوٹ جایا کرتا تھا ایک بار لاہور سے چلے جانے کے بعد دوبارہ اسی روز لاہور آنا دشوار ہوتا تھا۔

۱۶۔ راقم نے مرید کے کے زمانہ قیام ہی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل کر کے جمع کروا دیا تھا اور مرید کے کے قیام کا ایک سبب یہ تھا کہ وہاں کام کے لیے یکسوئی میسر تھی، ایک بار لاہور سے چلے جانے کے بعد ''از گوشہ بامی کہ پریدیم پریدیم .....'' کی کیفیت ہوتی تھی۔ پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری ۱۹۹۹ء میں ملی۔

آغا صاحب کی یہ مبارک باد خاصی لیٹ ہے۔

۱۷۔ پی ایچ۔ڈی میں راقم کا موضوع کلیات میرسوز کی تدوین تھا۔ابتدائی طور پر اس مقالے کا مقدمہ اورینٹل کالج میگزین جلد ۷۲ شمارہ ایک ۱۹۹۹ء میں بہ طور میرسوز نمبر کے شائع ہوا۔اسی مقدمے کو میرسوز سوانح اور شخصیت کے نام سے کتابی صورت دی گئی،(لاہور:اورینٹل کالج،۲۰۰۰ء)

۱۸۔ عارفہ اقبال ایم اے اردو کی طالبہ تھیں،اب وہ ڈاکٹر عارفہ شہزاد ہیں اور شعبہ اردو پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ان کا شعری مجموعہ عورت ہوں نا دستاویز مطبوعات لاہور سے ۲۰۱۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔

۱۹۔ فلیپ کی یہ عبارت بہ طور خط ارسال کی گئی۔یہ ایک بلا تاریخ خط ہے تاہم ڈاکخانے کی مہروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ملفوف لاہور سے ۱۹/جون ۲۰۰۶ء کو ارسال کیا گیا اور اگلے ہی دن یعنی ۲۰/جون ۲۰۰۶ء کو مجھے اورینٹل کالج میں مل گیا۔جس کتاب کے لیے یہ فلیپ لکھا گیا وہ راقم کا تیسرا شعری مجموعہ نظم مجھ سے کلام کرتی ہے لاہور: تناظر مطبوعات ۲۰۰۶ء ہے۔اس سلسلے کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے راقم کا مضمون ''ڈاکٹر وزیر آغا.....تم سے مجھ تک'' روزنامہ نئی بات لاہور ۲۳/مئی ۲۰۱۸ء

۲۰۔ اس نظم پر پسندیدگی کا اظہار رسالہ کاغذی پیرہن کے سرورق پر شائع کر کے بھی کیا گیا۔نظم کے متن کے لیے: نظم مجھ سے کلام کرتی ہے،ص:۱۰۹۔۱۰۰

۲۱۔ یہ تحریر راقم الحروف کی کتاب اپنی دنیا آپ پیدا کر کے لیے لکھی گئی،(لاہور:گلوب پبلشرز، ۱۹۸۹ء)،ص:۹۔۱۱

۲۲۔ سہو طباعت کے باعث اصل لفظ محو ہو گیا۔

۲۳۔ زاہد منیر عامر(مدیر)، پرواز نو، ادبی مجلّہ،(سرگودھا: گورنمنٹ پولی ٹیکنک انسٹی ٹیوٹ،۱۹۸۴ء)، ص:۲۳۔۲۴

۲۴۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی پہلی کتاب مسرت کی تلاش طبع اوّل لاہور:اکادمی پنجاب ۱۹۵۴ء۔اسی ادارے سے ۱۹۵۶ء میں اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔طویل وقفے کے بعد زمانہ حال میں اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا۔دیکھیے:(لاہور:اظہار سنز،۲۰۱۲ء)

مآخذ:

۱۔ وزیر آغا،مسرت کی تلاش،لاہور:اظہار سنز،۲۰۱۲ء۔

☆☆☆